Fikr-o-Nasar (Islamabad) 25:3 (1988)

منٹگمری واٹ کی کتاب محمدؐ ایٹ مکہ پر ایک نظر

سید صباح الدین عبدالرحمن

ڈبلیو منٹگمری واٹ نے محمد ایٹ مکہ ، محمدؐ ایٹ مدینہ، محمدؐ دی اسٹیٹسمین وغیرہ لکھ کر بڑی شہرت حاصل کرلی ہے۔ ان کے مضامین ایسے جرائد میں نکلتے ھیں جو مسلمانوں کی راسخ العقیدگی کے حامل ھیں ۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دھلی میں قرآن پاک کی دوسری بین الاقوامی کانگریس دسمبر ۸۲ء میں ہوئی تھی ۔ وہ بھی اس میں مدعو تھے اور ان کی بعض رائے کے حوالے بھی تقریروں میں سننے میں آئے ان کی تصانیف کی شہرت تو سنی تھی لیکن پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا ان کی تصانیف خاص طور پر حاصل کیں ۔ ان کا مطالعہ شروع کیا تو معلوم ھوا کہ وہ ان ھی مستشرقین میں ھیں جو انتہائی زھریلی باتیں اپنے طاقت ور اور ماھرانہ انداز میں کہہ کر اپنی مطلب برآری کی کوشش کرتے ھیں ۔

میرے پیش نظر اس وقت ان کی کتاب محمد ایٹ مکہ کا وہ ایڈیشن ہے جو ۱۹۵۲ء میں چھپا، اب اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ھیں، نئے ایڈیشن سامنے نہ رھنے کی وجہ سے یہ نہیں معلوم ھو سکا کہ پہلے ایڈیشن اور بعد کے ایڈیشن میں کیا کیا ترمیمات کی گئی ھیں ۔ لیکن پہلے ایڈیشن میں سب سے پہلے اس کتاب کے ماخذوں پر نظر پڑی، اس میں زیادہ تر اھرینس، رچرڈ بل، بوھل، کیتانی، انسائکلوپیڈیا آف اسلام، گولڈزیہر، جیفری، نکلسن، نولدیکی،

ولہاوسن وغیرہ کے نام ملے۔ بخاری کا ذکر ضرور ہے لیکن اس سے مدد فرانسیسی ترجمہ سے لی گئی ہے قرآن مجید کو رچرڈ بل کے ترجمہ سے سمجھا گیا ہے۔ ازرقی کی کتاب اخبار مکہ کا سہارا جرمن اسکالر وسٹن منلڈ سے لیا گیا ہے ابن ھشام کی کتاب سیرت رسول اللہ ، ابن سعد کی طبقات، طبری کی تاریخ الرسل والملوک اور واقدی کی کتاب المغازی کا ذکر ضرور کر دیا گیا ہے مگر یورپی مصنفوں کی کتابوں کے حوالے اس کثرت سے ہیں، کہ عربی کی تصانیف دبی ہوئی نظر آتی ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے فضلاء نے تحقیق وتدقیق کا یہ معیار قائم کر رکھا ہے کہ اس میں حوالے معاصر ماخذوں اور نہیں تو زمانہ کے لحاظ سے قریب تر زمانہ کے ماخذوں کے حوالے دے کر اس کو مستند اور وقیع بنایا جائے .. ترجمہ کے حوالوں سے اس کا پایہ گر جاتا ہے پھر بہت بعد کے مصنفوں کے حوالوں سے تحقیقی تحریر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ لیکن زیر نظر کتاب کے مصنف نے زیادہ تر انیسویں اور بیسویں صدی کے مصنفوں کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور ان ھی کا سہارا لیا ہے۔ جن سے ان کی نیت کے کھوٹ کو مدد پہنچ سکتی ہے اور پھر عربی کی اصل کتابوں کے حوالے کے بجائے ان کے ترجمے سے استفادہ کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اس کتاب کی وقعت بڑی حد تک گر جاتی ہے۔

ابن اسحاق ، ابن ھشام، کتاب المغازی از واقدی اور طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری کے حوالے مصنف نے ضرور دیے ھیں ، مگر اسی حد تک جتنے ان کے لیے مفید تھے۔ ان کتابوں کا جو ناقدانہ تجزیہ کیا گیا ہے اس سے مصنف بظاھر بے خبر معلوم ھوتے ھیں۔ ابن اسحاق نے فن مغازی میں شہرت حاصل کی ، وہ امام فن مغازی سمجھے جاتے ھیں مغازی میں زیادہ تر لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا ذکر ھوتا ہے اس

لیے یہ فن سیرت نگاری سے مختلف ہے۔ ابن اسحاق پر یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے بعض واقعات یہودیوں سے سن کر لکھے ہیں ، اس لیے ان پر پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک گروہ ان کو ثقہ سمجھتا ہے تو اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار قرار دیتا ہے۔ محمد بن اسحاق ھی کی کتاب کو زیادہ منقح اور اضافہ کرکے ابن ھشام نے اپنی سیرت مرتب کی لیکن ان پر یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو زیادہ تر بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص سمجھے جاتے ھیں لیکن امام بخاری کے استاد ابن مدینی اور نسائی کہتے ھیں کہ وہ ضعیف ھیں ابو حاتم بھی کہتے ھیں کہ وہ استناد کے قابل نہیں۔

واقدی کی روایتیں تو موجودہ دور کے سنجیدہ علمی حلقوں میں بالکل قابل قبول نہیں سمجھی جاتی ھیں ، کیونکہ اس کی لغو بیانی مسلمہ عام ہو چکی ہے ، محدثین کہتے ھیں کہ وہ اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے ، اس لئے وہ اس کو کذاب کہتے ھیں ۔ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ھیں :

,,دنیا جانتی ہے کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے ، جس کا شمار معتبر مؤرخین میں نہیں ھو سکتا ۔ تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ھی ہے ، جیسے آپ ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں .... امام شافعیؒ نے اگرچہ اس سے روایت کی ہے مگر یہ صاف تصریح ہے کہ امام موصوف اس کی تصنیفات کو جھوٹ کا انبار کہا کرتے تھے (مقالات سلیمان جلد ۲ صفحہ ۱۱۸) .

پھر واقدی کس طرح معتبر ھو سکتا ہے ؟

طبقات ابن سعد کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے ، جو روایتیں واقدی سے لی گئی ھیں، وہ اس لیے صحیح نہیں سمجھی جا سکتی ھیں کہ یہ ابن سعد میں درج ھیں ۔

طبری کی تاریخ مستند ضرور ہے لیکن وہ بہت سی روایتیں ایسے زاویوں کے ذریعہ بیان کرتا ہے ، جن میں بہت سے ضعیف الروایہ اور غیر مستند ھیں ۔ اس لیے سیرت پر جو کچھ لکھا ہے اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا ہے ۔

آج سے تقریباً ستر برس پہلے علامہ شبلی نے سیرت کے ماخذوں پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے ، جو اب تک چراغ راہ اور نشان منزل کی حیثیت رکھتے ھیں ، ان کا خیال ہے کہ مغازی واقدی، سیرت ابن ھشام، سیرت محمد ابن اسحاق اور تاریخ طبری وغیرہ سیرت و تاریخ کی کتابیں ضرور ھیں ، لیکن سیرت کی تصنیفات میں ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ھو (سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۹۷) وہ یہ بھی لکھتے ھیں کہ روز مرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ھشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کیجاتی ھیں ۔ لیکن جو واقعات کچھ بھی اھمیت رکھتے ھیں ۔ ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لینے اور کدو کاوش کرنے کی خاص ضرورت ہے (ص ۱۰۱) مولانا شبلی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی ترتیب کے کچھ اصول بتائے ھیں جس کی وضاحت مختصر طریقہ پر اس طرح کی جا سکتی ہے کہ سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کےمتعلق جوکچھقرآن مجید میں مذکور ہے ان کو سب پر مقدم رکھا جائے ، کیونکہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ھیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ھو جاتا ہے ۔ قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے ، احادیث صحیحہ کے سامنے عام سیرت کی کتابوں کی روایتیں نظر انداز کر دی جا سکتی ھیں جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ھیں ، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اھم واقعات میں

خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ھیں ، بصورت اختلاف روایات احادیث کے رواۃ ارباب فقہ و ھوش کی روایات کو دوسروی پر ترجیح دینی چاھیئے ، سیرت کی کتابوں میں جو واقعات ھوں ان میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے ، اور جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاھدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ھوگی . لائق حجت نہ ھوگی ، اھم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کر لینی چاھیے کہ راوی سے ادائے مطلب میں تو غلطی نہیں ھوئی ہے وغیرہ وغیرہ ۔

مولانا شبلیؒ نے اپنے زمانہ میں لکھا تھا کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلام میں سے کسی نے بھی اس جانکاھی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ انھوں نے اس وقت یہ سوال اٹھایا تھا، کہ کیا ایک غیر مسلم ان قواعد اور اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے ۔ ڈبلیو منٹگمری واٹ سے بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے ۔ مگر وہ کیوں اس جانکاھی اور نکتہ سنجی کی زحمت گوارا کرتے ۔

وہ قرآن کے ماخذ کو یہ لکھ کر ھلکا کر دیتے ھیں ... کہ اس میں تو عقائد وغیرہ کی تفصیل ہے ، اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات نہیں ھیں اور یہ دعوی بھی کیا ہے کہ ان حالات کے بغیر عقائد کو توازن کے ساتھ سمجھا نہیں جا سکتا ہے ، خوب، زبور، توریت اور انجیل میں کیا اس زمانہ کے اس قسم کے سارے حالات مل جاتے ھیں ۔ تب ھی ان کے عقائد سمجھ میں آتے ھیں ۔

یورپ کے مصنفوں نے معلوم نہیں رسول اللہؐ پر کتنی کتابیں لکھی ھیں، فارسٹر، ارونگ، اسپرنگر، میور، مارگولیتھ ، اور خدا جانے اور کتنے ان گنت اھل قلم ھیں ۔ جنھوں نے آپؐ کی سیرت پر بہت کچھ لکھا ہے ، ایسا معلوم ھوتا ہے کہ آپ کی

سیرت پر کچھ لکھنا ان کے لیے فخر کی بات ہے اور ہونی بھی چاہیئے ۔ لیکن اس فخر کے ساتھ وہ اپنی طبیعت کے تقاضے کے مطابق نیش عقرب سے بھی باز نہیں آتے ، منٹگمری واٹ بھی یہ فخر حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لیے قلم اٹھایا اور مختلف جلدیں لکھ ڈالیں ، ان کا خیال ہے کہ محمدؐ کی ایک تازہ سوانح عمری اس لیے لکھنے کی ضرورت تھی کہ اسلام کے طلبہ آپ کی سیرت کا مطالعہ تاریخی نقطہ نظر سے کرنے کے خواہاں ہیں ۔ اس لیے انھوں نے مورخ بن کر اس کتاب میں اس زمانہ کے اقتصادی ، معاشرتی اور سیاسی پس منظر کو پیش کیا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں ایسے سوالات کے بھی جوابات ملیں گے جو پہلے نہیں اٹھائے گئے ۔ مگر اس کا فیصلہ ان کے ناظرین ہی کر سکتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے کیا ان کے پیشرو یورپین مصنفین نہیں لکھ چکے ہیں ارونگ ، میور اور مارگولیتھ وغیرہ کے ابتدائی ابواب میں وہ سب کچھ ملے گا جو مصنف نے اپنے ابتدائی باب میں لکھا ہے ، انھوں نے اپنے پیشرو مصنفوں کی تحریروں کو اپنے انداز میں مرتب کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے ناظرین کو یہ حق ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ چبائے ہوئے نوالے کو چبا رہے ہیں یا کوئی نئی بات پیش کر رہے ہیں ۔ یا اسی کتاب میں کس حد تک وہ مورخ ہیں ، کس حد تک عیسائیت کے خالص مبلغ اور حامی ہیں ۔ صحیح تو یہ ہے کہ وہ ایک خاص مقصد کے تحت اپنی کتاب لکھنا چاہتے تھے ، جس کے لیے وہ ایک نتیجہ پر پہلے پہنچ گئے تھے ۔ اسی کے مطابق اپنی تحقیق اور محنت کا صغری اور کبری مرتب کر لیا ان کا کیا مقصد ہے وہ آیندہ سطروں میں ظاہر ہوگا ۔

کتاب کے پہلے باب میں عرب کے اقتصادی، سیاسی ، معاشرتی اخلاقی، مذہبی اور ذہنی پس منظر کا احاطہ کیا گیا ہے اقتصادی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کا دعویٰ ہے کہ قرآن

ریگستانی فضا میں نہیں بلکہ اعلی تمول کی صورت میں نازل ہوا (ص ۳) لیکن اس دعویٰ کے باوجود وہ ایک چلتا ہوا فقرہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ عرب کے باشندے بھوک سے عاجز ہو کر فتوحات کے لئے چل پڑے (ص ۳) یہ لکھ کر ان کی فتوحات کی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کی مگر اقتصادی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نہیں بتایا کہ اس پس منظر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مدد یا رکاوٹ پہنچی، اس کی وضاحت کے بغیر عہد جاہلیت کے مکہ کی سیاست کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں جس کے تجزیہ میں ان کے دل کا گوشہ بڑا نرم ہوگیا ہے مکہ کی سیاست کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس میں قریش کی دھڑ بندی، حلف الفضول ، مکہ میں مختلف افراد اور قبائل کے اثرات، اس کی خارجہ پالیسی، اس پر بازنطینی، ایرانی اور حبشہ کی حکومتوں کی للچائی نظر، اس پر ابرھہ کے حملہ وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ محمدؐ کی بعثت اس وقت ہوئی جب مکہ میں بڑی دولت اور بین الاقوامی سیاست کی آمیزش ناگزیر طور پر تھی (ص ۱۱)

وہ ایام جاہلیت کے قریش کی عقلمندانہ اور صبر آزما سیاست دانی اور حلم کے بھی معترف ہیں، لکھتے ہیں، کہ ان کی سیاسی عقلمندی میں حلم چمکتا نظر آتا ہے (ص ۱۱) ان کی رائے ہے کہ ان کی قبائلی کش مکش معمولی درجہ کی تھی، جو مشترکہ مفاد ھی کی خاطر تھی، (ص ۸) وہ یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں، کہ مکہ میں جمہوریت تھی، اس کا موازنہ ایتھنز کی جمہوریت سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں ، کہ ایتھنز میں اخلاقی اصولوں اور ایمانداری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے لیکن مکہ کے لوگ اس کے لئے فکر مند رہتے کہ عملی مہارت سے ایک اچھا رہ نما کیسے ابھر سکتا ہے (ص ۱۰)

مکه کی خارجی پالیسی پر بھی بحث ہے جس کو پڑھنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی بچھڑا ہوا نہیں بلکہ ایک ترقی پذیر علاقہ تھا، وہ لکھتے ھیں که بازنطینی اور ایرانی امپائر جیسی دو بڑی قوتوں کے ساتھ حبشہ جیسی چھوٹی قوت کو بھی مکہ سے برابر دلچسپی رھتی، یہ دلچسپی اس کی تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے رھی، بازنطینی حکومت سے مکہ کے تعلقات دوستانہ رہے حبشہ بازنطینی حکومت کا دوست تھا، اس لیے ان دونوں قوتوں سے جب کوئی خطرہ نہ ھوتا، تو مکہ کا تجارتی کارواں دور دور تک جاتا، مگر جب حبشہ سے تعلقات اچھے نہیں رہے تو ابرھہ نے مکہ پر حملہ کر دیا، اس کے وجوہ یہ بھی رہے کہ ابرھہ کی نظر میں مکہ کی بڑھتی ھوئی نفع بخش تجارت کھٹکی ، پھر اسکو جو تقدس حاصل تھا، اس کی اھمیت بھی اس کو پسند نہیں آئی، شاید اس کے حرم کی دولت پر بھی اسکی للچائی نظر پڑی،پھر اس تجزیہ سے بھی محظوظ کیا ہے کہ مکہ اس زمانہ کی بڑی قوتوں کی کشاکش میں غیرجانب داری ھی کو اپنے لیے ضروری سمجھتا، اور جب بازنطینی اور ایرانی طاقتیں برسرپیکار ھوتیں، تو مکہ کی اس غیر جانب داری کی اھمیت بڑھ جاتی یہ سب کچھ لکھنے کے بعد وہ رقم طراز ھیں کہ مفید معلومات کے نہ رھنے کی وجہ سے یہ تمام باتیں قیاسات ھی سے لکھی جا رھی ھیں، جن میں اگر بہت سی تفصیلات صحیح نہیں بھی ھوں گی، تو اس کی عام مرقع آرائی (Soind) ھی نظر آتی ہے (ص ١٦) ایسے طرز استدلال اور انداز تحقیق کا کیا جواب ھو سکتا ہے مولانا شبلیؒ نے آج سے بہت پہلے ایسے یورپین سیرت نگاروں کے متعلق لکھا کہ وہ نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلولات پیدا کرتے ھیں ، جن میں بہت کچھ ان کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ھوتا ہے وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنالیتے ھیں اور تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ھیں، (سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۵۸)

مصنف کی تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر کوئی ناقد ان پر یہ اعتراض کرے، کہ انکی کتاب میں عرب کے ایام جاھلیت کے تاریک اور داغدار پہلوؤں کا ذکر نہیں تو وہ ان کی نشاندھی آسانی سے کر دیں گے، لیکن ان کے قلم کی چابکدستی اسی میں نظر آتی ہے کہ یہ تاریک اور داغدار پہلو اس دور کے روشن پہلوؤں کی تفصیلات میں دب کر رہ گئے ھیں، اب تک مسلمانوں کے سامنے ایام جاھلیت کی بڑی بھیانک تصویر تھی، جس کو مصنف اپنے خاص مقصد کے تحت رد کرنا چاھتے ھیں، وہ اس دور کی تجارتی سرگرمیوں اور دوسری خوبیوں کی مرقع آرائی اس لیے کرتے ھیں، کہ یہ ظاھر ھو کہ رسول اللہؐ کی بعثت کے بعد مسلمانوں سے ان کا تصادم ان کی اپنی قدروں کو برقرار رکھنے کی خاطر تھا، غزوات مذھبی لڑائیاں نہ تھیں بلکہ تجارتی برتری کی خاطر لڑی گئیں، وہ مکہ کے لوگوں کی معاشرتی اور اخلاقی خوبیوں کے بیان کرنے میں فراغ دلی سے کام لیتے ھیں، مسلمان مورخین تو یہ بتاتے ھیں، کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ھوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے، اس زمانے میں گھروں میں جائےضرورت نہ تھے، چھلنیاں نہ تھیں، بھو سے کو پھونک کر اڑاتے تھے، جو رہ جاتا تھا، وھی آٹا ھوتا تھا، بخاری کی حدیث سے ثابت ھوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، تاریخ اور ادب میں یہ تصریح موجود ہے کہ عرب کھنکھجورا، گوہ اور گرگٹ اور جانوروں کے چمڑے کھاتے تھے، بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہئیں تھی، قمار بازی شراب خواری اور زناکاری کا رواج عام تھا، لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ

کرنا عموماً جائز تھا، (سیرت النبیؐ جلد اول ص ۱۱۸ ۔ ۱۲۸) مولانا شبلیؒ نے مستند حوالوں سے لکھا ہے کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے اربابِ اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابو لہب جو خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا، اخنس بن شریق جو بنو زهره کا حلیف اور روسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، تمام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر ارباب جاہ مختلف قسم کے اعمال شنیعه میں گرفتار تھے، (سیرۃ النبیؐ جلد اول ۲۱۷) معارف مطبوعه مصر ۵۵)

مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اسی ظلمت، تیرگی اور تاریکی کو دور کرنے کے لیے ایک آفتابِ عالم تاب کی ضرورت تھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پوری ہوئی، لیکن ہمارے فاضل مصنّف موجودہ دور کی سیاسی ، اقتصادی اور عمرانی اصطلاحات کا سہارا لے کر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان مورخین جو کچھ بیان کرتے ہیں، وہ سراسر غلط ہے عربوں میں قبائلی یک جہتی کے ساتھ انفرادیت تھی، جب مختلف قبائل مل جاتے، تو ان کا اعلیٰ ترین یونٹ بن جاتا (ص ۱۷) ان میں اتحاد، ایک مشترکہ زبان، شعری روایت اور مادی مفاد کی بنا پر تھا، ان کی بدویانہ اقتصادیت تجارتی اور سرمایہ دارانہ اقتصادیت کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ (ص ۱۸) وہ لڑائی میں بہادر، مصیبت میں صابر، انتقام لینے میں مشتعل مزاج ، کمزوروں کے حامی، اور طاقت وروں کے خلاف سرکش ہوتے (ص ۲۰) ان میں فیاضی ، میزبانی، وفاداری، اطاعت شعاری جیسی اہم خوبیاں تھیں، ان کو اپنی آن، اور عزت زیادہ محبوب تھی جس کے لئے وہ قانون اور کسی بات کے صحیح و غلط کی پروا نہیں

کرتے تھے (ص ۲۱ ـ ۲۰) یہ عرب (Aristocracy) اور (Egalitarianism) کے مجموعہ تھے، ان میں مساوات تھی، لیکن جو بہتر سے بہتر ثابت ہوتا، ، وہی ان کا قائد بن جاتا، (ص ۲۲) اسی طرح عربوں کی اور خوبیاں اعلیٰ اخلاق، ان کی انسانی رشتہ داری کی روایت اور انسانی خوبیوں کا اعلیٰ معیار اس لیے دکھایا گیا ہے کہ اسلام کی عظمت کو عربوں کی ان خوبیوں سے بڑی مدد ملی، اور جب یہودیوں اور عیسائیوں کی وحدانیت کا تصور اس میں شامل کر دیا گیا تو اس میں اور بڑائی پیدا ہو گئی (ص ۲۳) یہ زور بیان اس لیے صرف کیا گیا ہے کہ اسلام کی عظمت و جلالت میں گویا ربانی پیامات والہامات کی تعلیمات کو کوئی دخل نہیں رہا ، لیکن یہی عرب جب اسلام قبول کر لیتے ہیں، تو ان کے لیے مصنف جیسے مستشرقین کے دلوں کا نرم گوشہ ختم ہو جاتا ہے ان عربوں میں زیادہ تر برائیاں نظر آتی ہیں،

مصنف نے عرب کے قدیم مذاہب کا مطالعہ نولدیکی ولہاوسن لیمنس وغیرہ کی تحریروں کے ذریعہ سے کیا ہے گو وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایسی معلومات جستہ جستہ ہیں، اس لیے قیاسات سے زیادہ کام لینے کا امکان ہے (ص ۲۳) وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی (ص ۲۳) اور محمدؐ کے زمانہ کے ایامِ جاہلیت میں مذہب کا اثر زیادہ نہ تھا ، (ص ۲۳)وہ پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے تھے، (ص ۲۳) مگر اپنی تحریر کا رخ بدل کر یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو یزدانی نہیں سمجھتے، بلکہ یزداں کا مسکن تصور کرتے، ان کی پرستش غالباً بیرونی اثرات کی وجہ سے تھی، وہ ان کی یزدانیت کے قائل نہ تھے، بدویوں (Nomads) کو تو ان پر اعتقاد بھی نہ تھا، وہ ان کو محض کاشتکاروں کا دیوتا سمجھتے ، (ص ۲۳) وہ یہ بھی لکھتے ہیں

که یه عرب مکه کے ارد گرد کے مقدس مقامات کی زیارت کو بھی جاتے، حرم یعنی مکه کے مقدس حلقه کا احترام بھی کرتے، اسی کے ساتھ وہ یه بھی لکھ جاتے ھیں که جنگ احد میں ابوسفیان اپنے ساتھ لات اور منات بھی لے گیے تھے، مگر وہ یه بھی لکھ جاتے ھیں، که اس کا تعلق مذھب کے بجائے تو ھم پرستی سے تھا، وہ لات و منات کا تو سرسری طور پر ذکر کر گئے ھیں لیکن اس زمانه میں جو اور دوسرے بتوں کی پرستش ھو رھی تھی، اس کو بالکل نظر انداز کر گئے ھیں صحیح بخاری (باب مکه) میں ہے که خاص خانه کعبه اور اس کے اطراف میں تین سو بت تھے، ان میں سے اھم بتوں مثلاً لات، عزی، منات، یغوث، یعوق، نسر، ود، صواع اور بعل کا ذکر تو قرآن پاک میں ہے اس زمانه کی بت پرستی کی تفصیل لکھنے کے بجائے مصنف اس پر زور دیتے ھیں که ان کا اصل مذھب قبائلی طرز کی انسان دوستی Humanitarianism تھا، یعنی افراد تو فنا ھوتے رھیں گے ، لیکن ان کا قبیله باقی رہے گا، اور اس کو رھنا چاھیے اور اس کی بقا کے لیے اس میں شریفانه اوصاف باقی رھنا چاھیے، جو شریف النسل خون ھی سے ممکن ہے۔ (ص ۲۵)

فاضل مؤلف نے یه ظاھر کرنے کی کوشش کی ہے که ایام جاھلیت کے عرب خدا کے قائل رہے طرز استدلال ہے که قرآن کی شروع کی آیتیں ان کو مخاطب کرتی ھیں، جو خدا پر یقین رکھتے تھے، یه لکھنے کو تو لکھ گئے، لیکن اسی کے بعد یه بھی کہتے ھیں، ان کا یه یقین بہت کچھ مبھم اور گنجلک ہے (ص ۲٦) پھر معلوم نہیں کس حواله سے یه لکھ گئے ھیں که قرآن میں سقر، القارعه اور الحطمه وغیرہ جیسے الفاظ بظاھر اس زمانے میں سمجھے نہیں گئے ، لفظ بظاھر بتا رھا ہے که وہ جو کچھ لکھ رھے ھین اس پر خود ان کو یقین نہیں پھر لکھتے ھیں که سورۂ قریش سے یه گمان (Suggesi) ھوتا

ہے کہ مکہ کے روشن خیال لوگ خدا ھی کی پرستش کر رھے تھے ، پھر یکایک یہ کہہ جاتے ھیں کہ خدا کے لیے عربی لفظ اللہ ال الہ کا مخفف ہے جس کے لیے یونانی لفظ (Hotheos) کی طرح دیوتا (god) کے ھیں لیکن عام طور سے اس سے خدا ھی کا مفہوم لیا جاتا ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ محمدؐ سے پہلے مکہ کے غیر اہل کتاب (Pagan) اللہ سے مراد کعبہ کے مخصوص دیوتا ھی کو لیتے ۔ اسی طرح جس طرح طائف کا دیوتا ال لات کہلاتا ۔ مصنف اپنے احتمالات کو جاری رکھتے ہوئے رقم طراز ھیں کہ اگر اللہ خدا کے لیے استعمال ھوا جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا بیان ہے تو پھر اس کے گنجلک ھونے کے مواقع عظیم ھو جاتے ھیں ۔ اس لیے اغلب یہ ہے کہ مکہ کے کچھ لوگ تو خدا کو تسلیم کرتے لیکن ان کا یہ خیال بھی رھا کہ خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کی بت پرستی میں ایسا تضاد نہیں جس کی بنیاد پر وہ اس کو رد کر دیں ان سطروں سے ظاھر ہے کہ مکہ کے عربوں میں توحید کا تخیل گنجلک سا تھا لیکن ھمارے مصنف کا قلم جب آگے بڑھتا ہے تو لکھ جاتے ھیں کہ وحدانیت کا تخیل عیسائیوں اور یہودیوں کے اثرات کی وجہ سے رھا ھوگا ۔ ان سے تال میل کس کس طرح رھا ۔ اس کی کچھ تفصیل بتانے کے بعد یہ بھی تحریر کرتے ھیں ۔ کہ مکہ میں عیسائی تھے اُن میں تاجر اور غلام بھی تھے لیکن ان کے اثرات اھم نہ تھے (ص ۲۷) پھر وہ یہ بھی کہہ جاتے ھیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات میں بہت سے عجیب و غریب خیالات بھی تھے ۔ جن میں وہ غیر معمولی تخیلات بھی تھے جو جعلی عیسوی عقائد (Gospel) سے حاصل کرکے عرب میں رائج کر دیے گئے تھے ، قرآن میں تثلیث یعنی باپ بیٹے اور کنواری مریم کے تصور پر تنقید ، یقیناً ان عیسائی عربوں پر تنقید ہے جو یہ خیال رکھتے تھے پھر مصنف اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے یہ بھی لکھتے ھیں کہ

جہانتک یہودیوں کے اثرات کا تعلق ہے یہ ان کو مقدس صحیفہ کے ذریعہ سے نہیں ہوئے بلکہ مختلف قسم کے ثانوی ذریعہ سے پہنچے مصنف کا یہ بھی احتمال کہ وحدانیت کے سلسلہ میں یہودیت اور عیسائیت کے اثرات کے علاوہ اور ذرائع سے بھی یہ اثر ہوا گو یہ بہت قلیل رہا ہوگا وہاں ایسے جھوٹے فرقے بھی رہے ہوں گے جن پر وحدانیت کے معاملہ میں یونانی فلسفہ کا اثر رہا ہوگا ۔ ایسے فرقے صابیین کے تھے۔ اس زمانے میں لفظ حنیف کا کچھ استعمال ہوا تو اس کی بھی ایسی ھی ممکن تعبیر ہے لیکن ان تمام احتمالات کا اشہب دوڑانے کے بعد مصنف یکایک یہ لکھ جاتے ہیں ۔

,,میں سادہ طریقہ پر یہ کہوں گا کہ وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی اچھی شہادت نہیں ملتی اور اگر کوئی ایسی تحریک تھی تو اس کے پیچھے سیاسی مقاصد تھے ۔ مثلاً عثمان بن الحویرث نے عیسائیت اس لیے قبول کی کہ وہ بازنطینیوں کی مدد سے مکہ کا تنہا فرماں روا ہو جائے،،(ص ۲۸)

یہ لکھ کر مصنف یہ کہہ جاتے ہیں کہ حنیفیوں کے اس روایتی بیان میں سچائی ہے کہ وہ ایک نئے مذہب کی تلاش میں تھے ، عرب اور خصوصاً مکہ میں چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جو مذہبی ماحول تھا ، اس میں بہت سے ایسے سنجیدہ لوگ رہے ہوں گے ، جو ایک خلا محسوس کر رہے تھے اور اپنی گہری ضروریات کو پورا کرکے اپنے کو مطمئن کرنے کے خواہش مند تھے ، اسی کے ساتھ اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ عربوں نے یہودی و عیسائی خیالات کو کچھ ترمیم کے ساتھ قبول کیا ، اس ترمیم کی وضاحت یہ کی ہے کہ انہوں نے تقدیر یا دھر کے پرانے خیالات کو خدا سے وابستہ کر رکھا تھا ۔ عربوں میں خدا کا خیال اس حد تک جاگزیں تھا کہ وہ اپنے توھمی مراسم کو بھی خدا

کے احکام ھی سے منسوب کر دیتے تھے ۔ مصنف کا احتمال آگے بڑھتا ہے اور وہ لکھتے ھیں کہ مکہ سے ابرھہ کی مراجعت کی پرانی تعبیر قرآن سے پہلے کی ھو سکتی ہے اور یہ خیال کہ عاد اور ثمود کے پیغمبر ھودؑ اور صالح تھے ، غالباً قرآن سے پہلے کا تھا اور یہودیت اور عیسائیت کے تخیل نبوت سے لیا گیا ہے ، یہ احتمال ان کی اس تحریر سے بھی ظاھر ہے کہ محمدؐ سے پہلے مسیلمہ نے پیغمبری کا جو دعویٰ کیا اس سے ظاھر ہے کہ نبوت کا خیال وھاں جڑ پکڑ چکا تھا ، (ص ۳۹) معلوم نہیں مصنف نے یہ کیسے لکھدیا کہ مسیلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا یہ تو اسلام کی ھر معمولی تاریخ سے معلوم ھو سکے گا کہ مسیلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نبوت کا دعوی کیا تھا لیکن آپ کی زندگی میں اس کی آواز نہیں سنی گئی، حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں اس کی آواز ابھری تو اس کے خلاف فوج کشی کی گئی اور وہ وحشی بن حرب کے ھاتھوں قتل ھوا ۔

اس قسم کی غلط بیانی اور احتمال کی خامہ فرسائی کے بعد مصنف آخر میں لکھتے ھیں کہ محمدؐ کی سیرت کے مطالعہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اھمیت دینا ضروری نہیں ، کیونکہ اس سلسلہ کی بہت سی تفصیلات متنازعہ فیہ ھیں لیکن اس کا احساس رکھنا ضروری ہے کہ ایسی خبریں ھوا میں محمدؐ کے پاس قرآن آنے سے پہلے تھیں اور یہ آپ کی ذات کی تیاری اور آپ کے مشن کے ماحول کا جز ھو گیا (ص ۲۹) اپنے قلم کی چابکدستی ظاھر کی ہے ۔

اس کے بعد مصنف نے اپنا ابتدائی باب ختم کر دیا ہے لیکن اس میں ان کے یقینات کے بجائے قیاسات، احتمالات، ظنیات، تاویلات اور بیجا معلومات کو زیادہ دخل ہے ، وہ بظاھر غالباً اندازہ کیا جانا ہے

ھوگا ، رھا ھوگا ، شاید اور خیال ہے۔ احتمال ہے وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا زیادہ لیتے ھیں وہ کیا کہنا چاھتے ھیں اس کا سمجھنا آسان نہیں ۔ وہ یہ بھی کہنا چاھتے ھیں کہ رسول اللہ کی نبوت سے پہلے عرب کچھ نہ کچھ وحدانیت سے متاثر تھے ، ان پر یہودیت اور عیسائیت کے تخیل وحدانیت کا بھی کچھ اثر پڑا لیکن جب وہ یہ کہتے ھیں محمدؐ کی سیرت میں یہودیوں اور عیسائیت کے اثرات کو اھمیت دینا ضروری نہیں ۔

قرآن مجید میں وھی سب کچھ ہےجو توراۃ اور انجیل میں ہے انجیل میں بھی وھی سب کچھ تھا جو توریت میں تھا ۔ قرآن مجید میں ہے۔

,,پھر ھم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا توراۃ میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا ۔ خود ھم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رھنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی توراۃ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی خدا ترس لوگوں کے لئے سراسر ھدایت اور نصیحت تھی ، ھمارا حکم تھا کہ اھل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وھی فاسق ھیں پھر اے نبی ھم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں جو اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اسکی محافظ و نگہبان ہے،، (المائدہ ۔ ۱۵ رکوع)

قرآن مجید ھی میں ہے۔

,,جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رھا ہے یہ بناوٹی باتیں نہیں ھیں بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ھیں ان ھی کی تصدیق ہے،، (سورہ الرعد رکوع ۱۱)

رسول اللہؐ کے زمانہ میں آج کل کے مستشرقین کی طرح یہ بھی اعتراض ہوا کہ قرآن مجید میں اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ اجی یہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔ یہ باتیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں اوز ساتھ ساتھ کچھ ان لوگوں کے بوجھ بھی سمیٹیں جنھیں بربنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں۔ دیکھو کیسی سخت ذمہ داری ہے جو یہ اپنے سر لے رہے ہیں۔ (النحل رکوع ۳)

قرآن مجید میں یہ بھی ہے کہ

,,دوسری طرف خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوتی ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ بہترین چیز اتری ہے۔ اس طرح کے نیکوکاروں کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے،، (النحل۔ ۱٦ رکوع۔ ۴)

جب مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں وحدانیت کی کوئی باضابطہ تحریک ہونے کی کوئی اچھی شہادت نہیں تو پھر قیاسات اور تاویلات کی گھنی جھاڑیوں میں قلم کا گھوڑا دوڑانا کہاں تک صحیح ہے۔

اصلی یہودیت اور اصلی عیسائیت میں توحید کا جو تصور تھا وہ ضرور اسلام میں آیا۔ اصل توریت اور اصل انجیل میں توحید کی وہی تعلیمات تھیں جو اللہ تعالی نے اپنے خاتم النبیین کے ذریعہ سے کلام پاک میں پیش کیں۔ اگر ان تینوں ربانی صحیفوں میں توحید سے متعلق ایک ہی بات نظر آئے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں خود اللہ تعالی نے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ اہل

کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دو کہ ایک بات مان لو جو تمہارے یہاں بھی وھی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو ۔

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لانعبد الا اللہ
(آل عمران ۔ ۶۴)

کہہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ همارے تمہارے درمیان برابر ہے. یہ کہ بجز اللہ کے هم کسی اور کی عبادت نہ کریں ۔

مفسرین نے اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے ۔

البتہ کلام پاک میں توحید کی وہ تعلیم نہیں جو تحریف شدہ توریت اور انجیل میں ہے ۔ مثلاً یہود کہتے هیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے هیں ۔ مسیحیوں نے بھی دعویٰ کیا کہ یسوع مسیح اللہ کے بیٹے هیں اصل انجیل میں ایسی کوئی تعلیم نہیں اور نہ اس میں یہ کہا گیا کہ اللہ یسوع مسیح اور مریم تینوں ایک هیں ۔ اسے تین مت کہو ایک کہو اصل انجیل میں حضرت عیسیٰؑ نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ میری ماں کو معبود مانو، یہود و نصاریٰ نے تو اللہ کو چھوڑ کر احبار و رھبان کو بھی اپنا رب بنا رکھا تھا قرآن مجید نے ایسے تمام عقائد کی تردید کی ۔

قرآن میں ہے :

وقالت الیہود عزیزابن اللہ وقالت النصاری المسیح ابن اللہ ط ذالک قولھم بافواھھم یضاھئون قول الذین کفروا من قبل قاتلھم اللہ انی یؤفکون . أتخذوا احبارھم ورھبانھم أرباباً من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امرو الا لیعبدو آ الھاً واحداً لا الہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون ۔ ویریدون ان یطفئوا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون ۔ (توبہ ۳۰ تا ۳۲)

,,یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے ، عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بے حقیقت باتیں ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں ۔ ان لوگوں کی دیکھا دیکھی ، جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے ۔ خدا کی مار ان پر ، یہ کہاں سے دھوکا کھا رہے ہیں انھوں نے اپنے علما اور درویشوں کو ..اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے۔ اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی ، حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں ۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو ۔ ،،

یہودیوں اور عیسائیوں نے توحید کی جس اصل تعلیم کو بھلا دیا تھا ، اللہ تعالی نے اپنے خاتم النبیینؐ کے ذریعہ سے اپنے آخری صحیفۂ آسمانی میں یاد دلا دیا، اس سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم میں یہودیت اور عیسائیت کا اثر ہے یا یہودیوں اور عیسائیوں سے سنی سنائی یا ان سے حاصل کی ہوئی ۔ باتوں کو قرآن مجید میں جمع کر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے تو ان کے یہاں جو بگڑی ہوئی تعلیم تھی اس کو رد کرکے اس کو سنوار نے کی کوشش کی ہے۔

اللہ کے لغوی اور نحوی اشتقاق کی بحث تو پرانی ہے جس کو چھیڑ کر اس مفہوم کو گنجلک کر دیا گیا ہے چاھے اس پر جتنی بحث کیجائے مسلمان عام طور سے یہی سمجھتے ہیں کہ یہ عربی لفظ ہے اور عربی کے اله سے مشتق ہے اور یہ تسلیم کہ یہ کلدانی اور سریانی کے الاھیا یا عبرانی کے الوہ سے مشتق ہے۔ اور یہ تسلیم کہ قرآن سے پہلے جاھلی شعراء کے یہاں یہ لفظ ملے گا لیکن سوال یہ ہے کہ کلدانی ، سریانی غبرانی بولنے والوں اور جاھلی شاعروں کے یہاں اور

قرآن اور اسلام میں اللہ کا تصور کیا ہے۔ اللہ کے استعمال سے یہ ظاہر ہے کہ ایام جاھلیت میں توحید تھی تو پھر مصنف کا یہ لکھنا کیا معنی رکھتا ہے کہ اس زمانے میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی (ص ۲۳) پتھروں اور درختوں کی پوجا ھوتی تھی (ص ۲۳) خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کو خیال رہا کہ ان کی بت پرستی میں ایسا تضاد نہیں جس کو وہ رد کر دیں ، اسی طرح وحدانیت کے سلسلے میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی اچھی شہادت نہیں ملتی (ص ۲۸) وغیرہ وغیرہ ایام جاھلیت میں اللہ کا ذکر ضرور ہے۔ اور کچھ تھوڑے سے لوگ توحید کے قائل رہے لیکن اس زمانہ کے عام لوگوں کا یہ مقصد رہا کہ اللہ کے سوا اور بھی معبود (الہ) ہے اس کے کچھ شریک بھی ھیں اس میں اور جنوں میں باھم کوئی رشتہ قائم ہے اس کے بیٹے اور بیٹیاں بھی ھیں وغیرہ اسی لیے ایم اے میور کو بھی یہ لکھنا پڑا کہ اس زمانے میں بت پرستی اور بنو اسمعیل کے بیہودہ اعتقادات کی لہر جوش مارتی ہوئی کعبہ سے آکر ٹکراتی تھی (دیباچہ XCVII) قرآن مجید نے ایسے تمام باطل عقائد اور توھمات کی تردید کی ، اور اللہ کے تصور میں اس کی وحدت ، وحدانیت ، مشیت، وسعت، قدرت، رحمت ، محبت کی ایسی اعلیٰ تعلیم پیش کی جو موجودہ توریت اور انجیل میں بگاڑ دی گئی تھی جس کو قرآن مجید اور اسلام نے پھر سے استوار کرکے نکھار دیا ، واضح رہے کہ جس زمانے میں وحی الٰھی آئی اس نے خدا پرستی میں کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں سکھائی ۔ پرانی ھی باتوں کی تعبیر انسان کے وجدانی عقائد و تصورات اور علم کے مطابق کر دی ، اس حقیقت کو مستشرقین اپنے مخصوص طرز کے معروضی مطالعہ کے ذریعہ جس رنگ میں چاھیں پیش کریں ، مگر حقیقت اپنی جگہ پر حقیقت ھی رہے گی خود قرآن مجید میں ہے : ۔

ما یقال لک الا ما قد قیل لک سئل من قبلک ان ربک لذو مغفرة و ذو عقاب الیم .(سورہ حم السجدہ رکوع ۴)

,,اے نبی تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔"

اسلام کی یہ صریح تعلیم ہے کہ سچے مذاهب درحقیقت ایک ہی ہیں ، ایک ہی پیغام ہے جو آدم سے لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سنایا جاتا رہا ہے۔ میرے استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون ,, رسول وحدت" میں اس کی تصریح اس طرح کی ہے کہ قرآن مجید نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں۔ دین اور شریعت جس کو منسک اور منہاج بھی کہتے ہیں۔

دین سے مراد مذہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر تمام مذاهب حقه کا اتفاق ہے۔ مثلاً خدا کی ہستی ، اس کی توحید ، اس کی صفات کاملہ ، انبیا کی بعثت ، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی ، اچھے اخلاق اور برے اعمال کی جزا و سزا ۔ یہ وہ اصل دین ہے جس میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی ۔ اس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیا آئے ، اس میں زمان ومکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں نہ قوم و ملت کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف ہوا ۔ وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں رہا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی اب اگر اس میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہوا تو یا تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے یا باہر کی چیزیں اس میں مل گئی ہیں اور اس کی حالت میں تغیر پیدا ہو گیا ہے دوسری چیز یعنی شرعہ، منہاج اور منسک وہ جزئیات احکام ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں ۔ مثلاً عبادت الہی

کے طریقوں میں ہر مذہب میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہے۔ عبادت کی سمتیں الگ الگ ہیں ، اعمال فاسد کے انسداد کی تدبیریں جدا جدا ہیں ، اب قرآن کے نقطۂ نظر سے مذاہب کے اختلاف کا یہ مطلب ہے کہ اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے۔ ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر ہے ، البتہ متفقہ حصول مقصد کے راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہتے ہیں ۔ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا ہے کہ وہ اسی ازلی اور ابدی صداقت کو دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اصل مرکز پر قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لئے مناسب ہوں ان کو بتائیں اور سکھائیں ۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرے صاحب شریعت نبی اسی وقت بھیجا گیا ہے ، جب پہلا صحیفہ کھو گیا ہے۔ یا ذہنی تحریکات اور دستی تصرفات سے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہہ ہو گئی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کے گم ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ پر تورات نازل ہوئی اور جب اس میں اختلافات پیدا ہوئے تو زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے جو عہد نامہ قدیم میں موجود ہیں ، پھر اس کی تکمیل کے لیے انجیل آئی اور جب اس میں انسانی اختراعات کا دخل ہو گیا تو قرآن اترا ۔

باب ۔ ۲

اس باب میں مصنف نے پہلے یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ رسول اللہ صلعم کے آباء واجداد کو مکہ میں اہمیت حاصل تھی کہ نہیں ان کا جو طرز استدلال عام طور سے اس کتاب میں ہے وہی اس باب میں بھی ہے ظاہر ہے کہ وہ اپنے ناظرین کے دلوں میں آپ کے اسلاف سے

متعلق کچھ نہ کچھ شکوک ضرور پیدا کر دینا چاہتے تھے ، اسی لیے اپنے خاص سلسلۂ معلومات سے پھر کام لیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے متعلق مولانا شبلی رقم طراز ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اگرچہ اباً عن جدٍ معزز اور ممتاز چلا آتا تھا لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا ، وہ نضر بن کنانہ تھے بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا اور ان ہی کی اولاد قریشی ہے نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا ۔ اس زمانہ میں حرم کے متولی علیل خزاعی تھے ، قصیٰ نے علیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حیی تھا ، شادی کی تھی ، اس تعلق سے علیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصیٰ کے سپرد کی جائے ۔ اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا قصیٰ نے ایک دار المشورہ قائم کیا جس کا نام دار الندوہ رکھا ، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے ، قافلے باھر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے .... قصیٰ نے بڑے بڑے نمایاں کام کیے جو ایک مدت تک یادگار رہے ۔ مثلاً سقایہ اور رفادہ جو خدام عرب کا سب سے بڑا منصب تھا ان ہی نے قائم کیا ، تمام قریش کو جمع کرکے تقریر کی کہ سینکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے۔ قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا ۔ اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا کہ حجاج کے کام آئے ، مشعر حرام بھی ان ہی کی ایجاد ہے۔ جس پر ایام حج میں چراغ جلائے جاتے تھے ۔ قصیٰ نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل

کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب ان ھی کو ملا ، علامہ ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصیٰ نے چونکہ خاندان کو جمع کرکے کعبہ کے آس پاس بسایا اس لیے ان کو قریش کہتے ھیں ۔ قصیٰ کے بعد قریش کی ریاست ان کے منجھلے بیٹے عبد مناف نے حاصل کی اور ان ھی کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ کا خاص خاندان ہے۔ انھی کے دوسرے بیٹے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ھاشم کے ذمہ حرم کے زائرین کیلئے سقایہ اور رفادہ کی خدمت سپرد ھوئی ۔ انھوں نے یہ فرض نہایت خوبی سے انجام دیا حجاج کو سیر چشمی سے کھانا کھلانے کے لیے سبیل رکھتے تھے ۔ تجارت کو نہایت ترقی دی ۔ روم کے قیصر اور حبش کے بادشاہ سے عرب تاجروں کے لیے ٹیکس معاف کرایا ۔ جس سے قریش کے قافلۂ تجارت کی عزت بڑھی ، عرب کے مختلف قبائل میں دورہ کرکے یہ معاھدہ کیا کہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچایا جائے گا ۔ ایک دفعہ قحط پڑا تو ھاشم نے شوربہ میں روٹیاں چورا کرکے لوگوں کو کھلائیں ، اسی لیے وہ ھاشم کے نام سے مشھور ھو گئے (سیرالنبیؐ ج ۱ ص ٦٦ ۔ ١٦٥)

مگر ھمارے مصنف نے ان کی اھمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے کہ حجاج کی دیکھ بھال کا معاملہ ایک ادنیٰ درجہ کی چیز تھی تجارت سے بڑے منافع حاصل ھو رھے تھے اس لیے یہ کام ھاشم کے حوالے کر دیا گیا تھا ۔ (ص ۳۰) ۔

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے متعلق لکھتے ھیں کہ انھوں نے چاہ زمزم کی کھدائی کرکے یہ تو ثابت کر دیا کہ ان میں کام کے ابتدا کرنے اور سرگرم عمل ھونے کی صلاحیت ہے اور خانہ کعبہ کی عزت برقرار رکھنے میں بھی حصہ دار تھے لیکن اس اعتراف کے باوجود وہ یہ بھی لکھ جاتے ھیں کہ یہ نہیں معلوم

ھوتا ہے کہ مکہ میں نمایاں آدمی تھے ، مگر کچھ نہ معلوم ھونے کے باوجود ان کو یہ معلوم ھو سکا کہ حجاج کو پانی فراھم کرنے کا حق ان ھی کو تھا ۔ پھر ان کی امتیازی حیثیت کو ظاھر کرنے کے لیے یہ لکھتے ھیں کہ ان کی لڑکیوں کی شادی مکہ کے بعض بہترین اور طاقتور ترین خاندانوں میں ھوئی ۔ یہ معلومات بھی فراھم کی ھیں کہ جب مکہ پر ابرھہ کا حملہ ھوا تو وھی صلح و صفائی کے لئے بھیجے گئے ۔ اس کی اھمیت یہ لکھ کر کم کردی ہے ۔ کہ وہ مکہ کے لوگوں کی طرف سے نہیں بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے ملے ، پھر لکھتے ھیں کہ ان کے ملنے کا جو بھی مقصد رھا ھو لیکن جب ابرھہ کی مراجعت ھوئی تو ان کی حکمت عملی کی خود بخود نفی ھو گئی ۔ پھر اپنی عادت کے مطابق قیاس سے کام لیتے ھوئے لکھتے ھیں کہ یہ ھم نہیں بتا سکتے کہ ابرھہ سے ملنے کے بعد عبدالمطلب کا اثر بڑھا کہ نہیں ۔ کیونکہ اس کے بعد ھی ان کی وفات ھوگئی ۔ لیکن یہ بہت آسانی سے بتا سکتے کہ ابرھہ سے ان کے ملنے سے اندازہ ھوتا ہے کہ ان کے قبیلہ کا حال برا ھو رھا تھا، اس قسم کا اندازہ لگانے میں مصنف بہت ماھر ھیں ۔

مصنف نے عبد المطلب کی اھمیت بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے پیش رو سوانح نگاروں میں میور نے ان کی عظمت اور سطوت کی پوری تصویر اپنی کتاب دی لائف آف محمد میں پیش کی ہے ۔ وہ لکھتے ھیں کہ چاہ زمزم کی کھدائی عبدالمطلب کی زندگی میں بڑی کامرانی تھی اور دوسرے کنوئیں چھوڑ دیے گئے اور سب اس کی طرف مائل ھوئے ، عبدالمطلب اس سے تمام زائرین کو پانی مہیا کرتے اور بہت جلد کعبہ کے حصہ دار ھو گئے ، ان کی شہرت بڑھتی چلی گئی ان کے خاندان کے طاقتور بیٹوں نے ان کے رتبہ کو اور بڑھایا اور وہ مکہ کے سرادار بن گئے ان کی یہ سرداری ان کی وفات تک

رھی ، میور نے یہ بھی لکھا ہے کہ امیہ کے قبیلہ کو عبدالمطلب کی خوشحالی اور شہرت سے رشک پیدا ھوا تو اس کے لڑکے حرب نے اپنی فوقیت دکھانے کی خاطر عبدالمطلب کو چیلنج دیا ، لیکن ایک قریشی نے ثالث بن کر عبدالمطلب کی برتری کا فیصلہ دیا جس کو حرب نے تسلیم نہیں کیا ، اسی دن سے بنو ھاشم اور بنو امیہ میں رشک و حسد پیدا ھونا شروع ھو گیا ۔ عبدالمطلب کے اقتدار اور طاقت میں اس وقت بھی اضافہ ھوا ، جب انھوں نے مکہ کے بنو خزاعہ سے باھمی اعتماد کا معاھدہ کیا ، یہ معاھدہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا ۔ اور جب ابرھہ نے مکہ پر کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے حملہ کیا تو مکہ کے لوگوں نے عبدالمطلب ھی کو اور سرداروں کے ساتھ ابرھہ کے پاس بھیجا ، ابرھہ نے اس حملہ میں عبدالمطلب کے دو سو اونٹ پکڑ کر ضبط کر لیے تھے ، عبدالمطلب ابرھہ کے پاس پہنچے تو اس نے ان کی بڑی عزت کی اس لیے ان کے اونٹوں کو اس امید پر واپس کر دیا کہ کعبہ کے منہدم کرنے میں مدد دیں ۔ عبدالمطلب نے اس کی بات نہیں مانی ، بات آگے نہیں بڑھی عبدالمطلب مکہ واپس آئے اپنے لوگوں کو تو پہاڑیوں کی طرف چلے جانے کو کہا لیکن کعبہ کے دروازہ کو پکڑ کر دعا کی کہ اے اللہ اپنے گھر کو بچالے اور صلیب کو اس پر فتح نہ عطا کر، اس کے بعد ابرھہ کی فوج میں وبا پھوٹ پڑی، وہ واپس ھوئی تو سمندر میں غرقاب ھوگئی اور ابرھہ بھی سنانی پہنچتے ھی مر گیا ۔ (دی لائف آف محمد ۔ دیباچہ CZVII)

میور کی تحریر سے معلوم ھوتا ہے کہ عبدالمطلب اپنے زمانہ کے اھم ترین ، معزز ترین اور متمول ترین سرداروں میں تھے ، مگر منٹگمری واٹ کی تحریروں سے ان باتوں کی تردید ھوتی ہے ، ان کا خیال ہے کہ حرب بن امیہ اور عبدالمطلب کے حریف ھونے کی روایت مشکوک ہے ۔ کیونکہ یہ بات زیادہ تفصیل سے نہیں بیان کی گئی ہے ۔

پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ عبدالمطلب ابرھہ سے مکہ کے تمام لوگوں کی طرف سے نہیں ملے بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور ابرھہ سے جاکر ملنے کی پالیسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قبیلہ کی حالت بد تر ہوتی جا رہی تھی ، اس قسم کے اندازے لگانا ایک مورخ کے شایان شان نہیں ، بھرحال میور اور منٹگمری میں کون صحیح ہے اس کا اندازہ لگانے کے بجائے یہ تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ یورپی اھل قلم اپنی مرضی کے مطابق جو چاھیں لکھیں اور اپنے زور قلم سے لکھ کر ناظرین کو متأثر کریں ۔ ڈی لیسی جانسٹن نے اپنا زور قلم یہ لکھ کر دکھایا کہ زمزم کی کھدائی کے بعد عبدالمطلب کا رتبہ اور اقتدار اپنے باپ سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور جو فضیلت قصیؒ کو حاصل تھی وہ ان کو حاصل ہو گئی اور ان کی شہرت بڑی بلندی پر اس وقت پہنچی جب ان کی وفات سے آٹھ سال پہلے ابرھہ نے مکہ پر حملہ کیا لیکن وبا سے اپنی فوج سمیت موت کے گھاٹ اترا ۔ (ص ۳۰ ۔ ۳۹) .

حلف الفضول کی تفصیل طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۸۲ کے حوالے سے مولانا شبلیؒ نے یہ لکھی ہے کہ لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سینکڑوں گھر برباد کر دیئے تھے ۔ قتل و سفاکی موروثی اخلاق بن گئے تھے ، یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی ، جنگ فجار سے لوگ واپس ہوئے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سرکردہ تھے یہ تجویز پیش کی ۔ چنانچہ خاندان بنو ھاشم، زھرہ اور تمیم عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاھدہ ھوا کہ ھم میں سے ھر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رھنے پائے گا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معاھدہ میں شریک تھے اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے کہ معاھدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو

سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے بلایا جائے تو میں حاضر ہوں (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۸۳) اب اسی بات کو مصنف نے کیا سے کیا کر دیا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے لکھتے ہیں :

کچھ دنوں کے لیے بنو ہاشم کی قیادت زبیر بن عبدالمطلب کے سپرد کر دی گئی ، یہ فجار اور حلف الفضول کا زمانہ تھا ، زبیر کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہوئی ۔ حلف الفضول کمزور قبیلوں کے اتحاد کا معاہدہ تھا ، اس میں نمایاں حصہ عبداللہ بن جدعان نے لیا ، کیونکہ اس کا اجتماع اس کے گھر میں ہوا تھا ، وہ فجار کی جنگ کے موقع پر مکہ کے اہم آدمیوں میں تھا ۔ (ص ۳۲) ۔

اوپر کی سطروں میں تو یہ لکھے گئے ہیں کہ حلف الفضول کمزور قبیلوں کا باھمی معاہدہ تھا، لیکن آگے چل کر لکھتے ہیں ۔

فجار کی جنگ اس وقت ہوئی جب محمدؐ پندرہ اور بیس کی عمر کے درمیان تھے ، اور کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں اپنے چچاؤں کی طرف سے اس میں تھوڑا حصہ لیا وہ حلف الفضول کے موقع پر شاید موجود تھے کہا جاتا ہے کہ بعد میں اس کی تعریف بھی کی ، اس معاہدہ کا مقصد نسبةً مضبوط تر اور متمول قبیلوں کی بدعنوانیوں کے خلاف انصاف کو برقرار رکھنا تھا ، اور یہ مقصد قرآن کی تعلیمات کے بعض مقاصد سے بہت قریب تھا (ص ۳۳) ۔ مولانا شبلیؒ کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ اس لیے ہوا کہ ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا لیکن مصنف نے اپنی طرف سے یہ اختراع کیا کہ یہ معاہدہ مضبوط اور متمول قبیلوں کے خلاف کمزور قبیلوں کی طرف سے تھا ، دونوں تعبیروں میں کافی فرق ہے ۔

زبیر بن عبدالمطلب کی نمایاں حیثیت کو مصنف نے اس لیے کم کرنے کی کوشش کی که وہ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کے چچا تھے اور وہ ابوالطالب کی بھی اچھی تصویر نہیں کھینچتے ، وہ لکھتے ھیں که ابوطالب اپنے قبیله کے سردار تھے (ص ۳۲) لیکن مولانا شبلیؒ کی تحقیق ہے که عبدالمطلب کے مسند ریاست پر حرب متمکن ھوا جو امیه کا نامور فرزند تھا ، مناصب ریاست میں صرف سقایه یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ھاتھ میں رھا جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۷۷ ـ ۱۷٦) ابوطالب برابر تجارت کرتے رھے لیکن مصنف کا بیان ہے که ان کی غربت کی وجه سے محمدؐ ان کے لڑکے علی کو اپنے ساتھ رکھنے لگے ـ یه صورت حال اس لیے پیدا ھو گئی تھی که ابوطالب میں نمایاں خوبیاں نه تھیں ـ پھر عبدالمطلب کی وفات سے پہلے اس قبیله کا زوال بھی شروع ھو گیا تھا (ص ۳۲) ـ

رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کے والد بزرگوار کے متعلق مصنف کا بیان ہے که وہ شاید محمدؐ کی پیدائش سے پہلے وفات پا گئے تھے (ص ۳۲) اور محمدؐ کی پیدائش شاید ان کے والد کی وفات کے بعد ھوئی (ص ۳۳) ـ مصنف نے اس تحریر میں ,, شاید،، لکھ کر اپنی تحقیق کا کچھ اچھا نمونه پیش نہیں کیا ، کیونکه اس میں کسی کو شک نہیں که رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کے والد کی وفات ان کی پیدائش سے پہلے ھو گئی تھی ، میور نے واضح طور پر لکھا ہے که ان کی وفات محمدؐ کی پیدائش سے پہلے ھی ھو گئی تھی(باب اول ص ۴) مــارگـولیتھ نے تو صاف طور پر لکھا ہے که یه یقینی ہے که مستقبل کے پیغمبر کے والد کی وفات بیٹے کی پیدائش سے پہلے ھو گی ـ (ص ۴۵) ـ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ کی اہمیت کو مصنف نے اپنی معروضی تحقیق سے ایک بار پھر گھٹانے کی کوشش کی پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ ,,مجموعی حیثیت سے یہ اثر پڑتا ہے کہ محمدؐ کا قبیلہ مکہ کی زندگی میں ایک زمانے میں آگے آگے تھا، لیکن محمدؐ کے مشن کے آغاز سے پہلے یہ زوال پذیر تھا، یہ محض کمزور اور غریب قبیلوں کا ایک نمایاں رکن تھا ، اس کے افراد شام کی تجارت سے دلچسپی لیتے رہے لیکن شاید عبد شمس اور مخزوم قبیلوں کی طرح بڑی تجارت کے حصہ دار نہ تھے (ص ۳۳) مصنف کا سخن تکیہ شاید اور غالباً ہے اس کی آڑ لے کر وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں ۔ شاید اور غالباً جیسے الفاظ سچی مورخانہ تحقیق پر دلالت نہیں کرتے ۔

مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی تاریخ ۵۷۰ء لکھی ہے ، اس کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے ، صرف یہ لکھ دیا ہے کہ عام طور سے یہی خیال کیا جاتا ہے ۔ میور نے یہی تاریخ لکھی ہے ۔ مارگولیتھ نے کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے ، ارونگ نے ۵۶۱ء کی تاریخ لکھی ہے (ص ۲۴) مولانا شبلیؒ نے ولادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء لکھی ہے ، اس کی سند میں رقم طراز ہیں کہ مصر کے مشہور ہیئت داں عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ میں دلائل ریاضی سے یہی تاریخ ثابت کی ہے ۔ (سیرۃ النبی ص ۱۷۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی کے جو واقعات قصے کے طور پر درج ہیں ان کے متعلق مصنف کا طرز استدلال وہی ہے جو عام طور سے ان کی اس کتاب میں ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کی شادی سے پہلے کے بہت سے قصے ہیں ، جو دینی انداز کے ہیں ، مگر ایک سیکولر مورخ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں یہ اس لیے بھی کہ ان واقعات کا ذکر محمد کی آئندہ زندگی میں نہیں کیا جاتا اور نہ

ان کی کوئی سند ہے۔ اس کے بعد اپنی تحریر کا رخ بدل کر کہتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ان کو اہمیت دیتے ہیں اس لحاظ سے وہ ان کے لیے سچے ہیں اور ان کے پیغمبر کی زندگی کے آغاز کا ایک مناسب دیباچہ ہے۔ اور پھر وہ اپنے شاید سے کام لیکر لکھتے ہیں کہ شاید ان کے بیان کرنے کا طریقہ ایسا ہے کہ جیسے یہ آنکھوں دیکھا حال ہے اور مثال میں ابن اسحق کی کتاب سے وہ سارے قصے چار صفحے میں نقل کر دیے گئے ہیں جو آپ کے ایام رضاعت سے سفر شام تک بیان کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ :

,,حضرت حلیمہ سعدیہ آپ کی رضاعت کے لیے تیار ہو گئیں تو ان کو اتنا دودھ ہونے لگا کہ آپ کے ساتھ آپ کا رضاعی بھائی بھی خوب سیر ہو کر دودھ پینے لگا اور وہ جب مکہ سے اپنے گھر واپس جانے لگیں تو ان کی اونٹنی نے راستہ میں خوب دودھ دیا اور اسی طرح برابر دیتی رہی اور جس گدھی پر سوار ہوئیں وہ بہت تیز چلنے لگی اور جس چراہ گاہ میں ان کی اونٹنی چرنے جاتی وہ بہت شاداب رہنے لگی۔ پھر اس میں آپ کے شق صدر کی تفصیل بھی ہے اور یہ بھی ہے کہ خود حضرت آمنہ نے بیان کیا کہ آپؐ جب پیٹ میں تھے تو ان کے اندر سے ایک نور نکلا جس نے بصرہ کے محل کو منور کر دیا پھر اس میں حضرت ابوطالب کے ساتھ آپؐ کے سفر شام کا ذکر ہے جہاں عیسائی راہب سے ملاقات ہوئی ، اس نے آپ کی نبوت کی بشارت دی اور بہت سی نصیحتیں کیں ،،

ابن اسحاق کی یہ تمام روایتیں غیر مستند سمجھی گئی ہیں۔ حضرت حلیمہ سعیدیہ کی رضاعت کے سلسلہ میں جو قصے بیان کئے گئے ہیں ان کو غیر معتبر سمجھ کر مولانا شبلیؒ نے بالکل رد کر دیا ہے۔ اور اپنی کتاب میں اس کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کیا ، انھوں نے شق صدر کے واقعہ کا بھی حوالہ نہیں دیا۔ سرسید احمد خاں نے

اپنے خطبات احمدیہ میں اس کی پرزور تردید کی اور لکھا کہ عیسائی مصنف ایک بڑی غلطی میں پڑے ہیں وہ اپنے یہاں کی مقدس کتابوں کو جن میں کتب تواریخ اور ملوک اور قضاۃ وغیرہ داخل ہیں اور توریت و انجیل کے ان تمام مقاموں کو جن میں تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں بمنزلہ وحی یعنی کلام الٰہی کے برابر سمجھتے ہیں اور ان سب کو ہر طرح کی غلطی اور خطا سے پاک جانتے ہیں حالانکہ ان میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں اسی طرح انہوں نے خیال کر لیا ہے کہ مسلمان بھی اپنی حدیثوں اور روایتوں کو ایسا ہی بے نقص سمجھتے ہوں گے اور اس خیال خام سے انہوں نے مسلمانوں کی تمام حدیثوں کو ناقابل خطا تصور کرکے اسلام پر نہایت سخت طعن و تشنیع کی ہے ۔ حالانکہ وہ خود بڑی غلطی میں پڑے ہیں کیونکہ مسلمان اپنے یہاں کی روایات و احادیث کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کہ اور تواریخ کے واقعات کو دیکھتے ہیں اور ان کو یوں ہی ممکن الخطا خیال کرتے ہیں ۔ مسلمان اپنے یہاں کی حدیثوں اور روایتوں کو اس وقت صحیح سمجھتے ہیں جب ان کے لیے کافی ثبوت اور معتمد سند پاتے ہیں ورنہ ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے ۔ یہ روایتیں جو شرح السنہ اور دارمی میں مذکور ہیں صحت سے بہت دور ہیں ۔ بعض علمائے اسلام ان کو محض ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں اور بیہودہ افسانے خیال کرتے ہیں ، جو محض جہلا کو خوش کرنے کے لیے گھڑے گئے ہیں ۔ پس عیسائی مورخوں نے اس بات میں بڑی غلطی کی ہے کہ ان نامعتبر روایتوں کی بنیاد پر اسلام پر اعتراض کیا ہے (خطبات احمدیہ صفحہ ٦٥ ۔ ٦٦٤) ۔

سرسید نے یہ بات آج سے ۱۲۲ برس پہلے لکھی تھی مگر یہ مستشرقین جن میں منٹگمری واٹ بھی شامل ہیں ، دوسروں کی کب سنتے ہیں وہ تو اپنی سی کہنا جانتے ہیں ۔ اسی طرح بحیرا کی

ملاقات کی روایت کو مولانا شبلیؒ نے بالکل ساقط الاعتبار قرار دیا ، وہ تحریر فرماتے ھیں کہ :

سر ولیم میور ، ڈریپر اور مارگولولیتھ وغیرہ سب اسی واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ھیں اور اس بات کے مدعی ھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راھب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے اسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی ، اسلام کے تمام عمدہ اصول ان ھی نکتوں کے شروح اور حواشی ھیں ۔

مولانا شبلیؒ لکھتے ھیں کہ بحیرا کی ملاقات میں اس کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں ملتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملاقات کی روایت ھی بالکل ناقابل اعتبار ہے ، اس کے جس قدر طریقے ھیں سب مرسل ھیں ۔ راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۸۰)

منٹگمری واٹ نے ابن اسحق کی ان روایتوں کو یکجا کرکے اپنی علمی تحقیق کا ثبوت دیا ہے تو ان کی یہ تحقیق سعی نامشکور ہے اور ان کو نقل کرکے ان کی تضحیک کرنا مقصود ہے تو مسلمان محققین کب ان کو قابل اعتبار سمجھتے ھیں جو ان کی تضحیک سے وہ متأثر ھو جائیں گے ۔ یا اگر وہ واقعی ان کو اس لیے مستند اور صحیح سمجھتے ھیں تو یہ ابن اسحق کی روایتیں ھیں تو پھر ابن اسحق کی اگر ھر روایت اور ھر رائے صحیح ہے تو ابن ھشام اور واقدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے کلام الہی ھونے کے بھی قائل اور دعوی دار ھیں ، پھر منٹگمری واٹ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے الہامی کلام ھونے کا قائل اسی طرح ھونا چاھیئے جس طرح ابن اسحق ، ابن ھشام اور واقدی ھیں ۔ یہ دیانت دارانہ تحقیق نہیں کہ جو رائے مصنف کی

مطلب برآری کے لیے ہو تو وہ زوروں سے اچھالی جائے اور جو ان کے لیے قابل قبول نہ ہو اس سے انکار کیا جائے۔

●●●